سیالکوٹی عبقریت کا ایک نادر شاہکار

الدرة الثمینة

شبیر احمد خاں غوری۔ علیگڑھ

سیالکوٹ کی خاکِ مردم خیز سے دو عبقری روزگار پیدا ہوئے :۔ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی اور علامہ محمد اقبال۔ مؤخر الذکر پر بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر اول الذکر پر بہت کچھ لکھنا باقی ہے، بالخصوص ان کے رسالہ "الدرة الثمینة"[1] پر جو اسلام کی تفکیری سرگرمیوں میں نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل امور قابل غور ہیں :۔

الف۔ "الدرة الثمینة" کو اسلامی علم کلام کی تاریخ میں واسطة العقد کی حیثیت حاصل ہے[2]۔

---

[1] علامہ عبدالحکیم نے خود اس رسالہ کا کوئی نام تجویز نہیں کیا۔ انہوں نے اسے ایک بے عنوان مقالہ کی شکل میں بڑی عجلت سے مرتب کیا تھا۔ مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

[2] اس کی تفصیل "علم کلام کی تاریخ میں الدرة الثمینہ کا مقام" میں آرہی ہے۔

ب۔ یہ اسلامی ہندوستانی عبقریت کا عظیم کارنامہ اور "فتاوائے تاتارخانیہ"[۱] اور "حجۃ اللہ البالغہ"[۲] کے ہم مرتبہ ہے۔ لیکن فرنگ زدگی اور یورپ سے مرعوبیت کی وجہ سے جو احساس کمتری ہم پر طاری ہے اور جس کے نتیجے میں ہم اپنے اسلاف کے علمی بالخصوص عقلی و حکمی کارناموں کے ساتھ غفلت و بے اعتنائی برتتے رہے ہیں، اُس کی بنا پر "الہیات اعلیٰ" کا یہ قابلِ فخر شاہکار عرصہ سے گوشۂ خمول کی نذر ہو گیا ہے، یہاں تک کہ بڑے بڑے فضلاء بھی اس سے واقف نہیں ہیں۔

ج۔ اس سے ہندوستان اور ایران کے درمیان علمی و حکمی روابط کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

---

[۱] عہد فیروز شاہی (۷۵۲-۷۹۹ھ) کے مشہور فاضل و علم دوست امیر تاتارخاں کے ایماء سے مولانا عالم بن علاء اندرپتی نے یہ مجموعہ فتاوٰی مرتب کیا تھا چنانچہ شمس سراج عفیف نے اپنی "تاریخ فیروزشاہی" میں لکھا ہے:۔

"وہم چنیں خان اعظم (تاتارخاں) طالبِ دین یک فتاوٰی راست کنایندہ۔ وآں بریں نوع بود کہ جملہ نسخ فتاوائے شہر دہلی برخویش جمع کرد۔ در ہر مسئلہ و در ہر کلمہ کہ اختلاف ہریک مفتی است در فتاوائے خود نوشتہ و آنرا فتاوٰئے تاتارخانی نام داشتہ۔ واختلاف ہریک مفتی حوالہ بصاحب آں فتاوٰی کردہ۔ ایں چنیں فتاوٰی موازنہ سی جلد مرتب شدہ" (تاریخ فیروزشاہی از شمس سراج عفیف صفحہ ۳۹۱)۔

اسی طرح حاجی خلیفہ چلپی نے "کشف الظنون" (جلد اول صفحہ ۱۱۱) میں لکھا ہے:۔

"تاتارخانیہ فی الفتاوٰی:۔ للامام الفقیہ عالم بن علاء الحنفی و ہو کتاب عظیم فی مجلدات جمع فیہ مسائل المحیط البرہانی والذخیرہ والخانیہ والظہریۃ"۔

[۲] "حجۃ اللہ البالغہ" شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی مشہور تصنیف ہے جو اپنی شہرت کی بنا پر کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔

الرحیم حیدرآباد ۸۶۹

(الف) علم کلام کی تاریخ میں الدرۃ الثمینہ کا مقام

اصطلاحی علم کلام کا آغاز اسلامی تعلیمات کو عقلی توجیہ کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کے ساتھ ہوا اور چونکہ اس کوشش کے علمبردار بالعموم مسئلہ "کلام باری" میں انہماک رکھتے تھے، اس لئے یہ کاوش ذہنی اسی اصطلاح سے موسوم ہوئی۔

تفصیلات میں گئے بغیر اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ دوسری صدی ہجری کے آغاز میں اس علم (علم کلام) کے خصوصی نمایندے "معتزلہ" (معتزلہ ثالثہ) تھے جن کا سید الطائفہ واصل بن عطاء الغزال تھا۔ واصل کا شاگرد عثمان بن خالد الطویل اور موخر الذکر کا شاگرد ابوالہذیل العلاف تھا جو معتزلی فکر کے اندر نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ ابوالہذیل العلاف کا شاگرد ابویعقوب یوسف بن عبداللہ بن اسحاق الشحام تھا اور اُس کا شاگرد ابوعلی الجبائی۔

معتزلہ کا آغاز راسخ العقیدہ مسلمانوں سے اعتقادی مسائل کے باب میں اختلاف کی بناء پر ہوا مگر مسلمانوں میں یونانی فلسفہ کے داخل ہونے پر جب اسلامی تعلیمات سے اس کا تصادم ہوا تو طبقۂ متکلمین ہی نے اس سیلاب کا مقابلہ کیا اور اس طرح وہ نظام فکر ظہور میں آیا جو کلام بالمعنی الاخص (بمقابلہ فلسفہ) کہلاتا ہے اور جس نے خصوصیت سے فلسفہ کو اپنی تنقید وتردید کا موضوع بنالیا تھا۔

ابوعلی الجبائی کے شاگرد امام ابوالحسن الاشعری تھے جو پہلے اُستاد کی طرح معتزلی تھے مگر بعد میں بتوفیق ایزدی اعتزال سے تائب ہوکر اہل السنت والجماعت میں آملے تھے۔ اس سے پہلے علم کلام سنی حلقوں میں بنظر ناپسندیدگی دیکھا جاتا تھا۔ مگر امام اشعری کے سنی ہوجانے کے بعد یہ بات ختم ہوگئی اور اس طرح ایک حیثیت سے "سنی علم کلام" کا آغاز امام اشعری سے ہوا۔

امام اشعری اپنے ہمراہ اپنے سابق اساتذہ کی اُن کاوشوں کو بھی لائے جو اُنہوں نے یونانی فلسفہ اور دیگر ملل ونحل کی تعلیمات کی تنقید وتردید کے سلسلے میں کی تھیں۔ امام اشعری کے شاگردوں میں استاذ ابوالقاسم اسفرائنی مشہور تھے۔ اُن سے

امام الحرمین نے پڑھا اور اُن سے امام غزالی نے۔ امام غزالی کی "تہافت الفلاسفہ" یونانی فلسفہ کی تنقید میں ایک بے مثل تصنیف ہے اور اسلام کے کلامی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

"تہافت الفلاسفہ" کی ترتیب و تصنیف دو اصولوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ یونانی فلسفہ کی تنقید و تردید کے لئے امام غزالی نے ارسطو اور ارسطو کے فلسفہ کو سمجھنے کے لئے اُس کی اُن تعبیرات و توجیہات کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا جو ابونصر فارابی اور شیخ بوعلی سینا سے ماخوذ ہیں۔

۲۔ انہوں نے فلسفہ کے ان بیس مسئلوں کو اس تردید و تنقید کے لئے منتخب کیا جو اسلامی تعلیمات سے عموماً اور اہل السنت والجماعت کے مسلک سے خصوصاً متصادم ہیں۔

لہٰذا ان مسائل بستگانہ کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :۔

(۱) وہ مسائل جن کا اسلامی فرقوں میں سے کوئی نہ کوئی فرقہ قائل ہے۔ ایسے مسائل کے قائل کی تکفیر نہیں کی جاسکتی، اُسے صرف بدعتی کہا جاسکتا ہے۔

(۲) وہ مسائل جن کا مسلمان فرقوں میں کوئی قائل نہیں ہے کیونکہ وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کے قطعاً منافی اور "کفر بواح" کا مصداق ہیں۔

یہ تین مسئلے حسب ذیل ہیں :۔

الف ۔ قدم عالم۔

ب ۔ نفی حشر اجساد، اور

ج ۔ انکار علم باری تعالیٰ بجزئیات متغیرہ۔

گویا امام غزالی نے ابونصر فارابی اور شیخ بوعلی سینا کی براہِ راست تو نہیں البتہ ان مسائل ثلثہ کے قائل ہونے کی بناپر بالواسطہ تکفیر کی ہے۔

(اس امر کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کیونکہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کے "الدرۃ الثمینہ" کی اہمیت کو سمجھنے کے واسطے یہ بنیادی نکتہ کی حیثیت رکھتا ہے)۔

"تہافت الفلاسفہ" نے فلاسفہ کے کیمپ میں کھلبلی ڈال دی مگر کسی فلسفی کو اس کا

جواب دینے اور فلسفہ کی پوزیشن صاف کرنے کی جرأت نہیں ہوئی، تا آنکہ اگلی صدی کے اندر دور مغرب میں ابن رشد اندلسی نے امام غزالی کے "تہافت الفلاسفہ" کا جواب "تہافت التہافت" کے عنوان سے مرتب کیا۔ اور اس طرح حکماء و متکلمین کی نزاع کے ایک نئے باب کا افتتاح ہوا۔

یہ صورت حال تقریباً تین صدیوں تک جاری رہی۔ اس عرصے میں بڑے بڑے حکماء اور متکلمین پیدا ہوئے۔ حکماء میں ابوالبرکات بغدادی، شہاب الدین مقتول، نجم الدین نخوانی، محقق طوسی قطب الدین شیرازی، نجم الدین کاتبی قزوینی، اثیرالدین ابہری وغیرہم اور متکلمین میں امام رازی، قاضی ناصرالدین بیضاوی، ابوالثناء محمود اصفہانی، قاضی عضدالدین الدیجی، علامہ سعد الدین تفتازانی وغیرہم، جن کی تنقید اور بازتنقید سے فلسفہ وکلام کی ثروت میں بیش بہا اضافے ہوتے رہے مگر مسائل زیر بحث کا خاتمہ نہیں ہوا۔

آخر کار اس نزاع کا خاتمہ روم کے اندر سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ کی علم دوستی نے کیا۔ اُس نے فضلائے دربار کو حکم دیا کہ امام غزالی کے "تہافت الفلاسفہ" اور ابن رشد کے "تہافت التہافت" کے درمیان محاکمہ کریں۔ دربار میں بڑے بڑے جلیل القدر عالم تھے، مگر اس کڑی کمان کے زہ کرنے کی جسارت صرف دو ہی فاضلوں نے کی: مولیٰ علاء الدین طوسی نے "کتاب الذخیرہ" میں اور مولیٰ خواجہ زادہ نے اپنی "تہافت الفلاسفہ" میں۔ سلطان نے دونوں کو نوازشہائے شاہانہ سے نوازا اور گرانقدر انعامات دیئے۔

اس طرح تین سو سال پرانی اس علمی و فکری نزاع کا خاتمہ ہوا۔

مگر جب دسویں صدی کے آغاز میں صفویوں نے قومی سلطنت قائم کی تو ملک میں "احیائیت پسندی" اور "باستان پرستی" کی تحریکیں بھی وجود میں آئیں اور عظمت ماضی کے جذبے نے قدیم مفکرین اور ان کے افکار کے ساتھ والہانہ عقیدت و وابستگی کو جنم دیا۔ (1)
لہٰذا مذکورۃ الصدر مسائل ثلاثہ کی بنا پر امام غزالیؒ نے ابونصر فارابی اور شیخ بوعلی سینا کی جو تکفیر کی تھی، اس کا از سر نو جائزہ لیا گیا اور حکمائے مابعد نے ان دونوں کے مواقف

کی جو توجیہات کی تھیں، ان کو خصوصیت سے موضوع مطالعہ بنایا گیا اور اسی "حکمائی تاویل" میں تبحر و تمہر کو مدعیان علم و فضل کا معیارِ کمال قرار دیا۔

ادھر دسویں صدی کے آغاز سے ہندوستان میں بھی "معقولات"[1] (فلسفہ و کلام) کا رواج بڑھنے لگا۔ بعد میں اور عوامل[2] نے بھی اس کی ترقی میں حصہ لیا اور آخر میں تو نصاب پر ...

[1] بدایونی نے لکھا ہے: "درزمانِ سکندر (۸۹۴-۹۲۴ھ) شیخ عبداللہ طلنبی ... و شیخ عزیز اللہ طلنبی ... بہندستان آمدہ علم معقول را دراں دیار رواج دادند"

[2] یہ عوامل حسب ذیل تھے:-

۱- بابر نے جب ہندوستان میں مغل حکومت کی بنیاد ڈالی تو اس کے ساتھ خراسان وماوراء النہر کے بہت سے علماء بھی آئے۔ یہ لوگ عموماً معقولات میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔

۲- محقق دوانی جو اس عہد کے عظیم ترین مفکر اور فلسفی تھے ان کے بعض تلامذہ گجرات اور ہندوستان میں آئے چنانچہ خطیب ابوالفضل تبریزی، سعید ابوالفضل استرآبادی اور ملا عماد گجرات میں اور خواجہ جمال الدین محمود (اور میر سید رفیع الدین صفوی) ہندوستان میں آئے۔ ان کے نفس گرم کی تاثیر سے یہاں معقولات کو خصوصیت سے ترقی ہوئی۔

۳- دسویں صدی کے آخر میں ایران کی ملحدانہ تحریکیں ہندوستان میں داخل ہونے لگیں چنانچہ بدایونی نے سلطان محمد خدابندہ کی اصلاحی کوششوں کے بعد لکھا ہے:- "اما الحاد ازاں بلاد سرایت بایں ولایت کرد" اور ان ملحدانہ تحریکوں کی بنیاد اکثر حالات میں فلسفہ پر قائم تھی۔

۴- اسی زمانہ میں اکبر نے اسلام کی ضد میں دین الٰہی جاری کیا جس کی اساس فلسفہ پر تھی چنانچہ بقول بدایونی اُس نے حکم دیا: "الہیین از علوم غیر نجوم و حساب وطب و فلسفہ نخوانند و عمر گرامی صرف آنچہ معقول نیست صرف نکنند"

۵- آخر میں امیر فتح اللہ شیرازی اکبر کی طلب پر دکن سے ہندوستان آئے اور اُن کے آنے سے یہاں حکمت و معقولات کا رواج اور بھی زیادہ ہو گیا۔ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے:- "تصانیف علمائے متاخرین ولایت ...... میر بہندوستان آورد۔ و در حلقۂ درس انداخت ..... وازاں عہد معقولات را رواجے دیگر پیدا شد"

معقولات ہی معقولات چھا کر رہ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طالب علم خود کو ارسطوئے زماں سمجھنے لگا اور اپنے علم و فضل کے دعوے کو قوتِ بحث و مباحثہ کے ذریعہ ثابت کرنے لگا۔

یہ صورت حال تھی کہ ۱۰۵۶ھ میں شاہجہاں نے تاجدار ایران (شاہ عباس ثانی) کے ساتھ سیاسی و ثقافتی تعلقات کی تجدید کے لئے جان نثار خاں کو سفیر بنا کر بھیجا۔[1] سفارت خانہ کے عملے میں دو شخص محمد فاروق مشرف اور محب علی واقعہ نویس بھی تھے، جنہیں اپنی معقولات دانی اور قوتِ بحث و حاضر جوابی پر ناز تھا۔ یہ لوگ کسی طرح وزیر اعظم ایران تک پہنچ گئے اور اظہار فضل و کمال کے لئے اُسے بھی مناظرہ کا چیلنج دے بیٹھے۔ وزیر اعظم (خلیفہ سلطان) نے جو اعلم علمائے عراق تھے، براہ راست تو ان کے منہ آنا پسند نہیں کیا، صرف بر سبیلِ امتحان اتنا کہا:۔

"امام غزالی . . . تکفیر ابو نصر فارابی و شیخ ابو علی سینا نمودہ و جمع تاویل کلام حکما کردہ اند۔ این مراتب را تقریر باید کرد"[2]

لیکن ہندوستانی فضلا کا علم محض بحاشی تک محدود تھا، لہٰذا اُنھیں مُنہ کی کھانا پڑی، بقول سعد اللہ خاں علامی:۔

"مدعیان دروغ چوں شمع کشتہ بے فروغ ماندند واز مسلک معقولیت دور اُفتادند"[3]

(مسلسل)

---

[1] بادشاہ نامہ عبد الحمید جلد دوم ص ۴۹۳۔

[2]، [3] تذکرہ باغستان لامام الدین الریاضی ورق ۶۸۴ الف۔ مخطوطہ لکھنؤ یونیورسٹی۔